ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.1 (2026)
(January to March)

شاہین کمال کے افسانوں میں واحد متکلم کی تکنیک اور سقوط ڈھاکہ کے اثرات، تجزیاتی مطالعہ

An Analytical Study of the First-Person Narrative Technique and the Effects of the Fall of Dhaka in the Short Stories of Shaheen Kamal

ڈاکٹر بینش صدیقہ
لیکچرار، شعبہ اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی، آرٹس، سائنس اور ٹیکنالوجی، کراچی

Dr. Beenish Siddiqua
Lecturer department of Urdu, Federal Urdu University, Arts, science & Technology, Karachi
beenish.siddiqua@fuuast.edu.pk

Article Details
Received:
February 28, 2026
Accepted:
March 15, 2026
Online Published:
March 30, 2026

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: This study analyzes the use of first-person narrative (wahid mutakallim) in Shaheen Kamal's short stories and examines the impact of the Fall of Dhaka on her fiction. It highlights how her narratives, rooted in personal experience, create a strong sense of realism and emotional depth. The consistent use of first-person perspective allows readers to connect closely with the narrator's inner feelings, though it may also limit multiple viewpoints. The paper explores how her stories document the suffering of Bihari communities and reflect historical trauma, displacement, and identity loss. Ultimately, Shaheen Kamal's work is presented as a blend of fiction and lived reality, serving as a powerful literary record of a significant historical tragedy.

Key words: analyzes, Shaheen Kamal, personal experience, historical trauma, historical trauma, displacement

اُردو کہانی گوئی و افسانہ نگاری کی دنیا میں شاہین کمال کا نام کچھ زیادہ پرانا نہیں۔چند برس قبل ۲۰۰۹ء میں اول اول ان کی تحریریں سوشل میڈیا کی زینت بننا شروع ہوئیں، جنھوں نے پڑھنے والوں کو چونکا دیا۔بظاہر عام سے کرداروں سے بنی ان کہانیوں کی خاص بات ان کا حقیقت سے قریب تر ہونا تھا۔اگر یوں کہا جائے کہ ان کہانیوں پر مکمل حقیقت کا گمان ہوتا تو بے جا نہ ہوگا۔کہانیوں کے قبول عام نے شاہین کمال کو یہ حوصلہ دیا کہ اپنی خود نوشت "کتھا اجڑے دیار کی" کے بعد وہ ان کہانیوں کو بھی کتابی شکل میں شائع کروائیں۔ان میں سے ایک کتاب "دھبے خون جگر کے" ہے۔جس کی تمام کہانیاں سقوط ڈھاکہ پر مبنی ہیں ۔ان کی خود نوشت کا ایک حصہ بھی سقوط ڈھاکہ کے افسانوں پر مشتمل ہے۔جب کہ "تیری میری کہانی" مختلف موضوعات پر مبنی کہانیوں پر مشتمل ہے۔

شاہین ان تحریروں کو "کہانی" کا نام دیتی ہیں۔"دھبے خون جگر کے" کا پیش لفظ مشہور ناول اور کالم نگار سہیل پرواز نے لکھا ہے۔ جن کا ناول ڈھاکہ، میں آوں گا کافی معروف ہوا ہے۔ سہیل پرواز شاہین کی کہانیوں کو "افسانے" قرار دیتے ہیں۔اسی کتاب میں جرمنی میں مقیم ادیب سرور غزالی صاحب کی تحریر بھی شامل ہے۔انھوں نے بھی ان تحریروں کو کہانی کے بجائے افسانہ قرار دیا

ہے۔ کہانی اور افسانے میں فرق کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے اس حوالے سے یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ سلیم اختر کہانی کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

> کسی واقعہ، ماجرا یا فرد کا احوال بیان کرنا کہانی کے زمرہ میں آسکتا ہے۔ ہر افسانہ میں کہانی ہوتی ہے، لیکن ہر کہانی افسانہ نہیں ہو سکتی۔ افسانہ اپنی تکنیک کا پابند ہے۔ لیکن کہانی کے لیے کوئی تکنیک مخصوص نہیں۔ جس طرح غزل کی روح غزلیت ہے، اسی طرح کہانی کا رس کہانی پن ہے ۔یعنی دلچسپی۔۔۔ گر یہ نہیں تو بابا باقی کہانیاں ہیں۔(۱)

جب کہ افسانے کے حوالے سے ان کی رائے کچھ یوں ہے۔

> مختصر افسانہ کی جداگانہ تکنیک ہے ۔جو ناول سے اخذ شدہ ہونے کے باوجود انفرادیت کی حامل ہے۔ مختصر افسانہ میں پلاٹ، کردار، مکالمے، ماحول کی تصویر کشی، جزئیات نگاری اساسی کردار ادا کرتے ہیں۔ مختصر افسانہ کو جو چیز ناول سے ممیز کرتی ہے وہ ہے وحدت تاثر ۔دیکھا جائے تو افسانہ کا سارا مزا تاثر یا تاثیر وحدت تاثر کی ہے۔ وحدت تاثر کا مطلب یہ ہے کہ افسانہ میں صرف ایک تھیم یا ایک موضوع اور ایک مرکزی کردار ہو۔ تمام افسانہ اس کے مدار پر گردش کناں رہے۔ اسی سے وحدت تاثر جنم لے گی۔(۲)

اگر ہم کہانی اور افسانے کی درج بالا تعریفوں کو سامنے رکھیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی کہانی میں درج ذیل عناصر موجود ہوں تو وہ افسانہ کہلائے گی۔

* افسانہ ایک ایسی نثری تحریر ہے۔ جس میں اختصار لازمی ہے۔
* اس تحریر میں انسانی زندگی کے کسی پہلو کا حوالہ ہو۔
* ایک مرکزی کردار ہو۔ جس کے ارد گرد افسانہ بنا گیا ہو۔
* وحدت تاثر ہو۔
* تخیل کی کارفرمائی ہو۔
* اس میں کوئی واضح آغاز یا انجام ضروری نہیں۔

یہ مصنف کی مرضی ہے کہ وہ چاہے تو اس کا اختتام سوالیہ چھوڑ کر قاری کو سوچنے پر مجبور کرے یا انجام واضح کر دے۔ کہانی اور افسانے کی تعریف اور لوازمات کی روشنی میں ہم شاہین کمال کی ان کہانیوں کو برملا "افسانے" قرار دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان میں "تخیل" کی کارفرمائی بھی ہے۔ وحدت تاثر بھی بھرپور ہے۔ شاہین کمال کے افسانوں کی سب سے منفرد بات یہ ہے کہ کہ تقریباً ہر کہانی "واحد متکلم" کی تکنیک کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ واحد متکلم قواعد کی رو سے ضمیر ہے جسے انگریزی میں فرسٹ پرسن سنگولر کہا جاتا ہے۔ ریختہ لغت کے مطابق واحد متکلم کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

واحد متکلم: قواعد، ضمیر واحد متکلم وہ ضمیر جو کلام کرنے والا اپنے لیے استعمال کرے۔(۳)

قواعد اُردو میں مولوی عبد الحق لکھتے ہیں۔ وہ الفاظ جو بجائے اسم کے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ضمیر کہلاتے ہیں۔ جیسے وہ نہیں آیا۔ میں آج نہیں جاوں گا۔ اس میں "وہ" اور "میں" ضمیر ہیں۔(۴)

ضمائر متکلم کی حالتیں بیان کرتے ہوئے مولوی صاحب نے ،میں مجھے اور میرا جیسے الفاظ کو "واحد متکلم" بیان کیا ہے۔ اُردو فکشن میں واحد متکلم کا استعمال نیا نہیں۔ کلاسیکل افسانوں اور دیگر اصناف میں یہ ایک اہم بیانیہ تکنیک کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ اس تکنیک کے ذریعے قاری کو کہانی کے مرکزی کردار کی سوچ، داخلی جذبات واحساسات اور تجربات سے بڑی آسانی سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اس تکنیک کو اگر صحیح سے برتا جائے تو یہ فکشن کو حقیقت کے قریب تر اور اثر انگیز بنا دیتی ہے۔ اور قاری کو اپنے ساتھ ایسے جوڑ لیتی ہے کہ وہ خود کو اس منظر کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔

"واحد متکلم" کے کردار کی صورت میں قاری خود کو قصے کے منظر کا حصہ سمجھتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے جذبات و احساسات کے ساتھ اس منظر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعینہ جب وہ ناظر کی حیثیت سے منظر کو دیکھتا ہے تو اس منظر کی شدت اور حدت کو قبول نہیں کر پاتا۔ گویا منظر کا حصہ بن کر منظر کو دیکھتا اور اور قاری کے جذبات و احساسات میں ہل چل مچا دیتے ہیں۔ اور وہ وقوعہ کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔(۵)

شاہین کمال نے اس تکنیک کو خوب برتا ہے۔ ان کی ہر تحریر پر یہی گمان گزرتا ہے کہ یہ من و عن سچا واقعہ ہے۔ اور یہ سب کچھ مصنفہ پر خود بیتا ہے۔ لیکن واحد متکلم تکنیک کی ایک مشکل یہ ہے کہ قاری تو قاری خود افسانہ نگار بھی کبھی کبھی اپنے ہی جال میں پھنس جاتا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی کہتے ہیں۔

واحد متکلم کے افسانے میں افسانہ نگار واقعہ بیان کرتے کرتے کبھی کبھی از خود گھبرا اٹھتا ہے کہ افسانہ نگار اور راوی دونوں ایک تو نہیں ہوتے جا رہے۔ افسانہ نگار اور راوی کی وحدت ایک دلکش جال ہے۔(۶)

شاہین کی یہ تکنیک ابتدا میں قاری کو چونکنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ سچا واقعہ سمجھ کر ان افسانوں کو پڑھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن مستقل یکساں تکنیک اسے اکتاہٹ کا شکار کرنے لگتی ہے۔ اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انھوں نے اپنے تمام تر افسانوں میں واحد متکلم پر ہی کیوں زور دیا۔ کسی اور تکنیک کا استعمال کیوں نہیں کیا۔ اس حوالے سے شمس الرحمان فاروقی افسانہ نگار کی ذہنی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے یہ نکتہ بیان کرتے ہیں۔

افسانہ نگار کو یہ شوق بھی ہوتا ہے کہ وہ قاری کو اس دھوکے میں ڈالتا رہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے وہ افسانہ نہیں ہے۔ یا پھر اس کو یہ لالچ پیدا ہوتی ہے کہ قاری کو یہ دھوکہ دے کہ جو کچھ وہ لکھ رہا ہے وہ محض افسانہ نہیں ہے۔ لہذا کبھی تو افسانہ

نگار صرف ایک شخص بن جاتا ہے۔ جس پر کوئی بات یا واردات گزری تھی۔ اور کبھی وہ واقعات کو گھڑنے والا اور افسانے کو عمارت کی طرح تعمیر کرنے والا معمار بن بیٹھتا ہے۔(۷)

لیکن شاہین کا کہنا ہے کہ ان کے افسانوں میں واحد متکلم کی تکنیک کی کوئی خاص وجہ نہیں۔ ان کا قلم اس انداز پر رواں ہے ۔اسی لیے انھوں نے اسے مستقل مزاجی سے برتا ہے۔ "واحد متکلم کردار" قصے کا ایک ایسا مرکزی کردار ہے۔ جو کہانی میں پر پیچ واقعات کی الجھنوں کو بڑے سبھاو سے دور کرتا ہے۔ ساتھ ہی قصے کے ثانوی کرداروں کے جذبات و احساسات، اور اندرونی الجھنوں کو قاری تک پہچانے کا وسیلہ بنتا ہے۔ لیکن اس کا ایک نقصان ہے۔ "واحد متکلم" کردار کہانی کو مستند اور معتبر تو بناتا ہے۔ مصنف یہ باور کروانے کی کوشش کرتا ہے کہ وقوعہ کے موقعے پر میں خود موجود تھا۔ لیکن اس کوشش میں افسانہ نگار، قاری کے ذہن پر حاوی ہو جاتا ہے۔ قاری 'واحد متکلم' کی عینک لگا کر واقعات کو پرکھ رہا ہوتا ہے۔ اس کی نظر سے واقعات کو جانچ رہا ہوتا ہے۔ ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں لیکن مصنف قاری کے ذہن کو تصویر کے دوسری جانب دیکھنے نہیں دیتا جس کی وجہ سے افسانے کا حسن ماند پڑ سکتا ہے۔

شاہین کا بچپن مشرقی پاکستان میں گزرا۔ اکہتر کا سانحہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ڈھاکہ کے کھاتے پیتے بہاری گھرانے سے تعلق رکھنے والی شاہین کا خاندان لٹ پٹ کر پاکستان پہنچا۔ یہ حقیقتاً آگ و خون کی ہولی تھی۔ مکتی باہنیوں سے سامنا ہونے کے باوجود ان کے پورے خاندان کا بچ نکلنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ ان دلخراش واقعات کی تفصیل شاہین نے اپنی خود نوشت میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ بچپن میں سہا گیا یہ المیہ شاہین کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ سقوط ڈھاکہ پر یوں تو شعر و ادب کی کئی تخلیقات وجود میں آئیں۔ لیکن جس چابک دستی سے شاہین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ واقعات ہیں جو ان کے دل پر رقم ہیں۔ لکھاری جب تک اس درد سے گزرا نہ ہو، اس کے قلم میں وہ کاٹ پیدا ہو ہی نہیں سکتی جو پڑھنے والوں کے دلوں کو پگھلا دے۔ کتھا اجڑے دیار کی" کے پیش لفظ میں پرویز بلگرامی لکھتے ہیں۔

شاہین کمال کی تخلیقات ماحول کی عکاس ہیں۔۔۔ یہ افسانے نہیں درد کا الاپ ہیں۔ اس وقت کے زخم کو عیاں کیا گیا ہے۔ جب ملک دو لخت ہوا تھا۔ اس سانحے کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ ہر دل درد سے بھر اٹھے۔ یہ قصے، افسانے نہیں سچ کا پرتو ہیں۔ اس سچ کا جسے بھگتنے والوں نے صحیح انداز میں بتایا نہیں۔ اور آج بھی بے شمار کہانیاں ان کہی ہی رہ گئیں۔ جتنا ظلم وہاں اُردو داں طبقے نے سہا۔ اس سے مغربی پاکستانی لاعلم ہیں۔ اس مجموعے کا مقصد بھی لوگ جان لیں کہ مشرقی بازو میں وطن کی محبت میں، حب الوطنی کی سزا کس طرح وہاں کے اُردو داں طبقے کو ملی ہے۔ کہ ترپن سال بعد بھی انہیں پاکستانی کہنا لوگوں کو قبول نہیں۔ میں تو اس مجموعے کو ایک تاریخ کہوں گا۔ کیونکہ قلم کارہ پر جو بیتی اس نے بیان کی ہے۔(۸)

"دھبے خون جگر کے" کہانیاں کیا ہیں۔ ایک خونچکاں داستان ہے۔ لہو رلاتی، کرلاتی، بین کرتی۔ کہیں ڈھاکہ کی خون میں ڈوبی سڑکیں ہیں۔ کہیں چٹگام اور سلہٹ کی ندیوں میں بہتا انسانیت کا خون۔ کہیں پلٹن میدان کی ذلت آمیز داستان سے لہجہ گلوگیر ہے اور

کہیں اسٹینڈرڈ پاکستانیز کے کیمپوں کی دل دہلا دینے والی روداد ہے۔ یہ محض سنی سنائی کہانیاں یا افسانے نہیں ہیں۔ یہ انسانی بے حسی کی ایک ایسی دستاویز ہے جس کا لفظ لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔ ان کی ہر کہانی پڑھ کے صاف محسوس ہوتا ہے کہ صرف کرداروں کے نام بدلے ہیں۔ باقی سب حقیقت ہے۔ مصنفہ کیوں کہ ان حالات کی چشم دید گواہ ہیں۔ اسی لیے ان واقعات کو اس چابک دستی سے کہانی کی صورت گری کی ہے کہ پڑھنے والا دل تھامے پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اسے کہیں بھی محض افسانے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ ہماری رائے میں یہ کہانیاں دراصل پاکستان کی تاریخ کی دستاویز ہے۔

> پورا شہر ویران تھا، سنسان تھا۔ کتے بھی لاشیں بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر آسودہ اور بدمست ہو کر ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے۔ وہ شہر کب تھا، وہ تو ایک لٹا پٹا جلا ہوا تعفن زدہ کھنڈر تھا۔ میں اپنے جلے ہوئے گھر کی دہلیز پر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ بختیار بھیا ہی نے گھر والوں کی باقیات اکھٹی کیں۔ اور ان کی تدفین کی۔ عفت اور بلقیس کی لاشیں گھر سے نہیں بلکہ قریبی جنگل سے برہنہ ملیں تھیں۔ میرا چھے ماہ کا حسنین بھی لخت لخت اپنی دادی کی لاش کے نیچے دبا پڑا تھا۔ اس دن کے بعد سے میں شاید پھر کبھی ہوش میں آیا ہی نہیں۔(۹)

مشرقی پاکستان میں رمضان کے آخری عشرے میں زندگی کے جہنم سے زبردستی رہائی دلوائی جارہی تھی۔ درندگی کا ایک کھیل تھا جو پوری شدومد سے جاری تھا۔ جہاں ایک دوسرے کی زبان کی بنیاد پر نفرت کے لاوے بھڑک رہے تھے۔ وہیں کچھ لوگ اور ادارے نفرت کے الاو کو بھڑکانے میں مصروف عمل تھے۔ مصنفہ نے آنکھوں دیکھا حال افسانے کا حصہ بنایا ہے۔

> دس نومبر کی صبح سڑک کے کنارے دو نامعلوم افراد کی لاشیں پڑیں تھیں۔ جس نے پورے محلے میں ہراس پھیلا دیا تھا۔ دن چڑھے آرمی کی جیپ آئی اور انھوں نے ہاتھوں کے اشاروں سے خون کا بدلہ خون کی ترغیب دی۔ محلے کے چند پرجوش اور بدعقلوں نے قریب کی بستی، کیلا باگان سے چند مفلوک الحال، بے ضرر بنگالیوں کو پکڑ کر ذبح کر دیا۔ اور اپنے تئیں انصاف کر کے محلے میں چوڑے ہو کر گھومتے رہے۔ مرنے والوں میں کوئی قلی تو کوئی سبزی فروش اور کوئی سائیکل رکشے والا تھا۔(۱۰)

شاہین کی افسانوں کی کتاب "دھبے خون جگر کے" اور خود نوشت "کتھا اجڑے دیار کی" ان دونوں کتابوں کا انتساب ان مظلوم محصورین کے نام ہے جو آج پچپن سال بعد بھی اپنی ہی زمین پر شناخت سے محروم ہیں۔ بے وطن ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں فیکٹریوں اور زمینوں کے مالک تھے۔ موت کے خوف سے ایسے بے گھر ہوئے کہ محصورین کے کیمپوں میں نسلیں ہی اجڑ گئیں۔ جہاں بے وطنی سی بے وطنی ہے۔ چند ماہ قبل جب راقمہ ایک عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ گئیں، تو کیمپوں کی حالت زار اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ پاکستان سے محبت کرنے والے لوگوں کی چوتھی نسل ان کیمپوں میں جوان ہو گئی۔ وہ کیمپ کیا ہے۔ کھولیاں ہیں جہاں دو افراد کھڑے ہوں تو تیسرے کی گنجائش نہیں نکلتی۔ غربت بیماری افلاس زبوں حالی۔۔ اور سب سے بڑھ کر بے وطنی اور شناخت سے محرومی۔۔

"کیمپ کے حالات اتنے ناگفتہ بہ کے زندگی وہاں سے منہ چھپا کر بالا ہی بالا نکل جاتی ہے۔ حانوروں کے باڑے سے بدتر ان بے بسوں کی کھولیاں ہیں۔ اتنی بدبودار اور غلیظ فضا کہ ناک پر رومال رکھنے کے باوجود آپ قے روکنے پر قادر نہ ہوں۔ ہماری بے بسی کو آزاد شہری محسوس کر ہی نہیں سکتے۔ وہ الم جو ایک بے وطن سہتا ہے۔ بھلا زمیں زادے، سفاک آسمان کی اس ستم ظریفی سے کیسے واقف ہوسکتے ہیں۔(۱۱)

سقوط کے موضوع پر لکھی گئی یہ کہانیاں یا افسانے نہیں ہیں۔ یہ ایک نوحہ ہے۔ قوم کے دل پر رقم وہ الم ہیں۔ جنھیں سن کر ہر محب وطن کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ معروف صحافی وشاعر وادیب اختر سعیدی لکھتے ہیں:

"دھبے خون جگر کے " میں شاہین کمال کا خونِ جگر ہی نہیں، خونِ دل بھی شامل ہے۔ اِس کتاب میں ۱۹ کہانیاں ہیں اور ہر کہانی اپنے اندر ایک داستان رکھتی ہے۔ سانحۂ مشرقی پاکستان کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا اور ہر محبِ وطن پاکستانی ہی اِس دل خراش المیے سے متاثر ہوا، لیکن جن افراد نے وہ ہول ناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے، اُن کی کہانیاں سُن کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ شاہین کمال نے سانحۂ مشرقی پاکستان کی کہانی بڑے پُرسوز انداز میں تحریر کی ہے۔ لکھنے والا جب تک کہانی کا حصہ نہ ہو، اُس کی تحریر میں درد محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ شاہین نے اپنے قلم کو بُرش کی طرح استعمال کرتے ہوئے ہر منظر تفصیل سے بیان کر کے پوری پینٹنگ آپ کے سامنے کھڑی کر دی ہے۔" بلاشبہ، یہ کتاب سابق مشرقی پاکستان کا نوحہ ہے۔(۱۲)

صرف سقوط ڈھاکہ ہی نہیں بلکہ شاہین نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا۔ جو اس سے قبل کسی مصنف کے قلم کی نوک پر اس حساسیت کے ساتھ نہیں آئے ۔ کیونکہ یہ سانحات اس قوم پر بیتے۔ جن کا تعلق ہندوستان اور بنگلہ دیش سے ہجرت کرنے والوں سے تھا ۔ وہ لوگ جن کو ملک خداداد میں قبولیت نہ مل سکی۔ اسی لیے ان کے سروں پر ٹوٹنے والی قیامت کسی بڑے ادیب و قلم کار کو نہ جھنجھوڑ سکی۔ لیکن شاہین نے ان موضوعات کو اپنے افسانے کا موضوع بنا کر غم سہنے والے اجڑے خاندانوں کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے افسانو ں میں "سانحہ قصبہ علی گڑھ " بھی ملے گا۔ اور "سانحہ پکا قلعہ "حیدر آباد بھی۔ ملکی خصوصا کراچی کی تاریخ کے وہ واقعات جس نے کئی دہائیوں تک شہر کی سیاست اور سماج کو نفرت کی بھٹی میں جھونکے رکھا۔ آج چار دہائیوں بعد ان سانحات کا زخم تازہ ہے۔ "شہر آشوب " ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔ جس کا مرکزی کردار " بے نظیر " ہے۔ وہ لڑکی جس کے والدین محصورین بنگلہ دیش کے کیمپوں میں عبرت ناک زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ مرتے کھپتے کسی طرح کراچی پہنچے، تو ۱۹۸۶ میں ہونے والے "قصبہ علی گڑھ " سانحے میں یہ خاندان اپنے کفیل کو کھو بیٹھا۔

'چودہ دسمبر ۱۹۸۶ کا دن ہمارے بچپنے کو اپنے ساتھ لے کر ڈوبا۔ اورنگی قصبہ میں وہ آگ لگی ،ایسی خون ریزی کی گئی کہ بنگال کی بربریت اور بے پناہی یاد

آگئی۔۔۔۔۔ جب قصبہ کالونی کے ہنگامے میں ابا یعنی شمس الدین شیخ کا قتل ہوا۔ پوری کی پوری سترہ گولیاں ابا کو چھلنی چھلنی کر گئیں تھیں۔ اماں جو انہیں بچانے لپکیں۔ تو کلہاڑی کا وار اماں کی کمر چیر تا چلا گیا۔ تاخیر سے علاج کے سبب اماں ہمیشہ کے لیے کبڑی ہو گئیں۔ (۱۳)

بہاری خاندانوں کے مصائب کے ارد گرد بنے گئے شاہین کے دیگر افسانوں کے برعکس "شہر آشوب" کا اختتام بہت دل گرفتگی والا ہے۔ بے نظیر کے والدین جو سقوط ڈھاکہ کے موقعے پر بنگالیوں کے ظلم کا شکار ہوئے۔ نصف خاندان گنوا کر اسٹینڈرڈ پاکستانیز کے کیمپوں میں رہے اور پھر سنہ ۱۹۷۵ میں اپنے ہم وطن، ہم زبانوں کے درمیان کراچی پہنچے، تو سکھ کا سانس لیا۔ اب وہ یہاں محفوظ ہیں۔ لیکن "اپنوں" کے ہاتھوں باپ کے بہیمانہ قتل نے بے نظیر کے خاندان کو دگر گوں کر دیا۔ "اپنی ہمت کے کہ پھر بھی جیے جاتے ہیں" کی عملی تفسیر بن کے بے نظیر ایک فیکٹری میں شفٹ انچارج اور اس کا چھوٹا بھائی پکوڑے سموسے کا تھال سجاتے بیچتے۔ اب ڈاکٹر بننے ہی والا تھا کہ اچانک زندگی پھر آزمائش بن گئی۔ اور ایسی آزمائش کہ اب تقدیر سے لڑنے والا کوئی نہ بچا۔ ۲۷ دسمبر ۲۰۱۷ کو سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے قتل کے روز کراچی میں جو خون کی ہولی کھیلی گئی۔ اس میں ایک بار پھر "اپنوں" کے ہاتھوں بے نظیر کی عصمت بھی تار تار ہوئی۔ اس کی کبڑی ماں نے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے بعد شوہر کی بہیمانہ موت بھی سہی تھی۔ لیکن بیٹی کا غم اس کی جان لے گیا۔ اپنی ماں جیسی بہن کی تلاش میں سرگرداں ڈاکٹر مرتضی بے نظیر کی تلاش میں کہیں کھو گیا۔

جنم جنم سے "پاٹلی پترا" میں بسا شمس الدین کا خاندان ہجرت کے پے در پے آزاد سہتا۔ سنہ ۲۰۰۷ میں مملکت خداداد میں اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ (۱۴)

"دھیے خون جگر کے" کے بیشتر افسانوں کا اختتام ناسٹیلیجیا کا شکار ضرور ہے، لیکن بے وطنی کا شکار ہونے والے "بہاری" اپنی جواں مردی کی بدولت زندگی کو کسی نہ کسی کامیاب مقام پر لانے میں ضرور کامیاب رہے ہیں۔

سچ کہوں تو ہم بہاری، بہادر شاہ ظفر کی نسل سے بہتر ہی رہے۔ کہ وہ بیروت کی گلیوں میں بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ اور ہم یہاں کراچی کی سڑکوں پر پسینہ بہاتے۔ رزق حلال کی جوکھم میں اپنی ہڈیاں گلاتے رہے۔ (۱۵)

جہاں ان افسانوں میں سقوط کا غم ہے۔ وہیں ان افسانوں کی بدولت شاہین کمال ایک سچی محب وطن اور انسانیت پر یقین رکھنے والی خاتون کی حیثیت سے سامنے آتی ہیں۔ انہیں صرف بہاریوں پر ہونے والے مظالم کا قلق نہیں بلکہ وہ ہر جگہ انسانی ہمدردی رکھنے والے ان عظیم بنگالیوں کو بھی نہیں بھولیں۔ جنھوں نے کہیں اعلانیہ اور کہیں چھپتے چھپاتے اپنے جیسے انسانوں کی زندگیاں محفوظ بنانے میں کردار ادا کیا۔ اور انسانیت کا حق ادا کر دیا۔ اگر اسٹینڈرڈ پاکستانیوں کے کیمپوں کی بدحالی کا غم ان کی جان کا روگ نظر آتا ہے تو ساتھ ہی پاکستان کے پالیسی سازوں اور فیصلہ سازوں کی شقی القلبی بھی ان کے افسانوں کا حصہ ہے۔

وہ بہت سہانا وقت اور چین کی گھڑی تھی۔ پھر رت بدلتی گئی اور محبت کے راگ بین اور سوگ میں ڈھل گئے۔ اب بیوروکریسی کی منافقت، جرنیلوں کی عیاشی و

ہوس اور سیاستدانوں کی عیاری و اقتدار پرستی نے نفرت کی ایسی پون چلائی جسے لاکھوں جانوں کا بلیدان بھی نہ بجھا سکا۔(۱۶)

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ اتنے دلخراش واقعات کے باوجود، "مشرقی پاکستان" جواب بنگلہ دیش ہے۔ مصنفہ کا "پہلا پیار" نظر آتا ہے۔ ڈھاکہ، سید پور، چٹاگانگ اور راجشاہی وہ علاقے ہیں جہاں افسانہ نگار کا بچپن گزرا۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک عمر کے بعد ماضی خاص کر بچپن، ہر ایک کو "ہانٹ" کرتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے موضوع پر لکھے گئے ان کے تمام افسانوں میں جہاں دکھ ہے، تکلیف ہے، دل خراشی ہے، انسانیت کا سوز ہے وہیں ڈھاکہ یا اس سے وابستہ لوگوں کی محبت سے لبریز بھی ہے۔ افسانہ نگار سر تا پا "عشق بنگال" میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس دو رنگی کیفیت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے ہجرت کا غم سہا ہو۔ تقسیم ہند کے وقت ہندوستان سے ہجرت کرنے والے لوگوں کا بھی دل کا ٹکڑا وہیں کہیں، ان کی جنم بھومیوں میں رہ گیا تھا۔ وہ خون کی ندیاں پار کرتے، ہجرت کے زخم سہتے پاکستان آتو گئے لیکن تاعمر اپنے آبائی علاقوں کی یاد میں آہیں بھی بھرتے رہے۔ شاہین کی زندگی کا بھی مختصر مگر یادگار ترین دور وہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے کرداروں کو سارا حسن، رعنائی اور دل کشی کے سارے پیمانے بنگال میں نظر آتے ہیں۔ اپنی جنم بھومی سے عشق انسان کی فطرت میں ہے۔ یہ وہ یاد ہے جو حساس لوگوں کو بھلائے نہیں بھولتی۔

> "دوسری وجہ فلوریڈا کا سمندر، جو مجھے کاکس بازار کے بپھرے سمندر کی یاد دلاتا ہے۔ میرا جنموں بھومی، میرا حسین و جمیل بنگال۔ اب میں کل حیاتی کو انگلیوں پر شمار کرتا ہوں۔ تو مشرقی پاکستان میں، میں سب سے کم عرصہ رہا۔ مگر کمال دیکھیے کہ میری یادداشت کا بڑا حصہ اسی مدت قلیل نے گھیرا ہوا ہے۔ آب و دانہ نے سدا میرے پیروں میں گرداب ہی باندھے۔ کہاں کہاں نہیں پھرایا۔ مگر میرا یہ کم بخت دل جہاں ٹھہرا تھا، وہیں ٹھہرا رہا۔ دل کا کیا کہوں یہ سب سے بڑا موحد۔(۱۶)

شاہین کمال نے بہت کم عرصے میں اپنی پہچان بنائی ہے۔ خونِ جگر سے لکھے گئے ان کے افسانے حقیقت اور خیال کا امتزاج رکھتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں لکھے گئے ان افسانوں کو بارش کا پہلا قطرہ سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ سید پور سے چٹاگانگ تک اس المیے پر بے انتہا کہانیاں بھری پڑی ہیں۔ جن میں بہت سے حقائق سے ابھی پردہ اٹھنا باقی ہے۔ شاہین صاحبہ نے تصویر کا دوسرا رخ دکھایا۔ ورنہ عموماً ہمیں یہی بتایا جاتا رہا ہے کہ بنگالی مظلوم تھے ان کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی۔ لیکن اسی دوران لاکھوں بے ضرر اُردو داں طبقے پر جو ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ اس کو ظلم سہنے والوں اور چشم دید گواہوں نے صحیح طور بتایا ہی نہیں۔ دوسروں کو تو چھوڑیے خود مغربی پاکستان میں رہنے والے بھی ان قیامت خیز حالات اور اس کی سنگینی سے واقف ہی نہیں۔ اس وقت بنگلہ دیش اور پاکستان کے تعلقات تاریخی بلندی پر ہیں۔ خصوصاً بنگلہ دیش کا جھکاو پاکستان کی جانب ہوا ہے۔ اس میں محبتوں کی اور حقائق کی موسلا دھار بارش ہونا باقی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ موسلا دھار بارش کب ہوتی ہے اور کون کون سے لوگ کس صنف ادب پر کام کرتے ہیں۔ اس طرح مشرقی پاکستان کے سانحے کے تناظر میں ایک وقیع ادب ظہور پذیر ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات، سنہ ندارد، ص:۲۱۵

۲۔ ایضا، ص:۴۱

۳۔ ریختہ لغت۔https://www.rekhtadictionary.com/meaning-of-vaahid-mutakallim?lang=ur

۴۔ عبدالحق، مولوی، قواعد اُردو، انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی، ۲۰۰۷، ص:۷۴

۵۔ رابعہ مقدس، پی ایچ۔ڈی مقالہ، اُردو افسانے میں واحد متکلم کا کردار، تجزیاتی مطالعہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ص:۱۵

۶۔ فاروقی، شمس الرحمان، افسانے کی حمایت میں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۰۶، ص:۱۱۸

۷۔ ایضا

۸۔ شاہین کمال، کتھا اجڑے دیار کی، بزم تخلیق ادب پاکستان، کراچی، ۲۰۲۳ء، ص:۱۷-۱۸

۹۔ ایضا، ص:۱۷۶

۱۰۔ شاہین کمال، دھبے خون جگر کے، گفتگو فورم پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۲۶ء، ص:۳۴-۳۵

۱۱۔ ایضا، ص:۔۱۶۵

۱۲۔ روزنامہ جنگ، سنڈے میگزین، ۲۴ مئی، ۲۰۲۶، ص:۱۸

۱۳۔ شاہین کمال، دھبے خون جگر کے، ص:۱۶۷

۱۴۔ ایضا، ص:۱۷۲

۱۵۔ ایضا، ص:۱۶۶

۱۶۔ ایضاص:،۵۳

۱۷۔ ص:۶۵

References in Roman Script:

1. Saleem Akhtar, Dr., Tanqeedi Istilahat, sanah nadarad, p. 215.
2. Ibid, p. 41.
3. Rekhta Lughat, https://www.rekhtadictionary.com/meaning-of-vaahid-mutakallim?lang=ur
4. Abdul Haq, Molvi, Qawaid-e-Urdu, Anjuman Taraqqi-e-Urdu Hind, New Delhi, 2007, p. 74.
5. Rabia Muqaddas, PhD Thesis, Urdu Afsanay Mein Wahid Mutakallim Ka Kirdar: Tajziyati Mutala ‘a, National University of Modern Languages, Islamabad, p. 15.
6. Farooqi, Shamsur Rahman, Afsanay Ki Himayat Mein, Maktaba Jamia Limited, New Delhi, 2006, p. 118.
7. Ibid.
8. Shaheen Kamal, Katha Ujray Diyar Ki, Bazm-e-Takhleeq-e-Adab Pakistan, Karachi, 2023, pp. 17–18.

9. Ibid, p. 176.
10. Shaheen Kamal, Dhabbay Khoon-e-Jigar Kay, Guftagu Forum Publications, Lahore, 2026, pp. 34–35.
11. Ibid, p. 165.
12. Roznama Jang, Sunday Magazine, 24 May 2026, p. 18.
13. Shaheen Kamal, Dhabbay Khoon-e-Jigar Kay, p. 167.
14. Ibid, p. 172.
15. Ibid, p. 166.
16. Ibid, p. 53.
17. p. 65.